"شب خون" کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ؛ ۱۹۶۶ء تا ۱۹۸۰ء

Urdu Short Stories Published in Shab-Khoon Magazine, A Case Study

رابعہ بی بی پی ایچ ڈی سکالر
ڈاکٹر الطاف یوسف زئی،
ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ

ABSTRACT:

"Shab Khoon" Magazine was started in ۱۹۶۶.It is the mouth piece of modernity. When the trend of modernity became common, it had some basic ideas different from the progressives modernity has liberated literature from the shackles of philosophy and ideology. It gave the creator freedom of expression. Now, the writer is free to write what he sees and feels on his own. The focus of the fiction writers of this period is on the individual. The myth of this age presents pictures of the social conditions and events of its time. Conflict, materialism, profiteering, selfishness, clerks' life, bureaucratic exploitation, racial discrimination, caste segregation with a drawstring, political oppression and exploitation are the themes of the myths of this period. It looks like a sack that encloses.

کلیدی الفاظ؛ شب خون، شمس الرحمان فاروقی، رشید امجد، اسلم جمشید پوری، پریم چند، جدیدیت۔

"شب خون" رسالے کا آغاز ۱۹۶۶ء میں ہوا۔ یہ وہ دور ہے جب جدیدیت کا رجحان واضح طور پر سامنے آچکا تھا۔ اس دور کے کچھ رسالے ایسے تھے۔ جنھوں نے اس رجحان کے تحت افسانہ لکھنے والوں کے افسانوں کو اپنے رسائل میں جگہ دی۔ ان ہی رسالوں میں ایک نمایاں نام "شب خون" کا ہے جو شمس الرحمٰن

فاروقی کی سربراہی میں شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے نے جدیدیت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ جدیدیت کا رجحان جب عام ہوا تو اس کے ترقی پسندوں سے مختلف کچھ بنیادی تصورات تھے کیونکہ یہ رجحان ترقی پسند تحریک کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آیا تھا، اس لیے اس کے بنیادی تصورات بھی ان کے نظریات سے مختلف تھے۔ ترقی پسند تحریک کی بنیاد نظریہ پر رکھی گئی تھی۔ اس لیے اس تحریک سے وابستہ جو لوگ تھے انھوں نے وہ ادب تخلیق کیا جو ان کے منشور اور ان کے نظریے کے اصولوں کے مطابق تھا۔ ترقی پسند تحریک کے انتہا پسند رویے نے جدید ادب کو فروغ دیا۔ ترقی پسندوں نے ادب کو ایک خاص نظریے کا پابند بنا دیا تھا لیکن جدیدیت نے ادب کو فلسفے اور نظریے کی قید سے آزاد کر دیا۔ ان کے خیال میں تخلیق کار کو اظہارِ رائے کی آزادی ہونی چاہئے وہ جو سوچتا ہے جو محسوس کرتا ہے وہ بیان کرے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس بارے میں لکھتے ہیں:

"جدیدیت نے سب سے پہلے یہ کہا کہ ادب کو کسی فلسفے، کسی نظریے، کسی پابندی کا محکوم نہیں ہونا چاہئے۔ ترقی پسند ادب کہتا تھا کہ ادیب کو ایک خاص نظریے کا محکوم ہونا چاہئے۔ ہم نے کہا کہ ادیب کو حق ہونا چاہئے کہ وہ کسی کی توقعات کو پورا کرنے کے لئے نہ لکھے بلکہ وہ اپنے طور پر جو سمجھتا سوچتا ہے وہ بیان کرے۔ دوسری بات یہ کہ زمانے کے نئے تقاضوں نے ادب کے معاملے میں بھی کچھ تبدیلیاں برپا کر دی ہیں۔ مثلاً اب لوگ ادب سے یہ توقع نہیں کرتے کہ اس سے کچھ اصلاح یا فائدہ ہو بلکہ لوگ یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ادب سے مجھے اپنے بارے میں، انسان کے وجود کے بارے میں، کیا معلوم ہو۔"(۱)

اس رجحان نے تخلیق کار کو اظہار رائے کی آزادی دی۔ ادیب اب کسی خاص نظریہ کا غلام نہیں رہا کہ وہ جو بھی ادب تخلیق کرے اس میں اس نظریے کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کا پرچار کرے بلکہ اب ادیب آزاد ہے وہ اپنے طور پر جو دیکھتا ہے جو محسوس کرتا ہے وہ لکھ سکتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی ادب کو کسی تصور کے تابع قرار دینا ادب کے حق میں نقصان دہ قرار دیتے ہیں اس بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"ترقی پسند افسانے (یا پریم چند کے نمونے پر لکھے ہوئے افسانے) کے مبلغوں نے اس افسانے کی تائید اس لئے کی تھی کہ اس میں "عوامی مقاصد" کی خدمت آسان تھی اور میں نے جدید طرز کے افسانے کی تائید اس لئے کی تھی ،اور اب بھی میں اس تائید پر قائم ہوں، کہ اس میں "عوامی مقاصد" کی خدمت افسانہ نگار کا اولین فریضہ نہیں تھا افسانے، یا کسی فن کو کسی غیر منطقی تصور کا تابع قرار دینا البتہ ایسی بات ہے جس سے ادب کی موت کا امکان قوی ہو جاتا ہے۔"(۲)

ادیبوں کا ایک بڑا گروہ سامنے آیا جنھوں نے نئی طرز کی بنیاد رکھی۔ یعنی شمس الرحمٰن فاروقی کی سوچ یہ تھی کہ ہم شعر کہنے لگیں یا کوئی افسانہ لکھیں تو خود کو پہلے سے پابند کر لیں کہ ہم اس تخلیق میں فلاں نظریے کی پابندی کر رہے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں کہ میں اس بات کی سخت مخالفت کرتا ہوں کہ کوئی

بطور امام، سیاسی رہنما یا بطور مربی ہم سے کسی نظریے کی پابندی کروائے۔ ادب کو اس قسم کی پابندی سے آزاد ہونا چاہئے۔ ترقی پسند تحریک کے تحت جو ادب لکھا گیا وہ مقصدی ادب تھا۔ اس میں معاشرتی مسائل اور انسان کی اصلاح پر توجہ مرکوز تھی۔ معاشرتی مسائل کو افسانوں کا موضوع بنایا اور کہا اگر سماج کے مسائل بیان ہو جائیں تو انسان کے مسائل بھی بیان ہو جائیں گے لیکن جدیدیت کے رجحان کے تحت لکھے گئے افسانوں کا محور فرد ہے ۔ فرد کی پریشانیاں اس کی ذہنی الجھنیں جدید افسانوں کا موضوع بنیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کو ترقی پسند نظریات میں جو چیز نامکمل لگتی ہے وہ بھی انسان کی ذات پر زور نہ دینا ہے۔ اس بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

"ترقی پسند نظریات میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ نامکمل معلوم ہوئی وہ یہ تھا کہ ان کے یہاں فرد پر کوئی زور نہیں تھا۔ انسان کے اپنے وجود پر، اس کے مسائل پر، اس کے اپنے داخلی باطنی تصورات پر، کوئی زور نہیں تھا۔ انسان صرف سماج کا حصہ تھا اور مفروضہ یہ تھا کہ سماج کے مسائل اگر بیان ہو جائیں تو انسان کے مسائل بیان ہو جائیں گے ۔ اس پر طرہ یہ کہ سماج کے مسائل کے بارے میں بتانے والا کون ہے کمیونسٹ پارٹی یا مارکس یعنی سماج کے کوئی ایسے مسائل ہیں جنھیں پارٹی پروگرام یا مارکسی تھیوری میں جگہ حاصل نہیں ہے تو وہ سماج کے مسائل نہیں کہلائیں گے۔ تو مطلب کہنے کا یہ ہے کہ سب سے پہلی بات مجھے یہ نظر آئی کہ خود میرے ایک انسان کی حیثیت سے، کوئی تصورات یا خیالات ہیں، کچھ پریشانیاں ہیں، کچھ ذہنی الجھنیں ہیں کچھ گہرائیاں ہیں میری لیکن ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے میں ان کو ظاہر نہیں کر سکتا کہ میرا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ وجود تو سماج یا پارٹی کا ہے۔"(۳)

جدید افسانے میں انسان کے داخلی باطنی تصورات پر زور دیا گیا اس کے وجود کو اہمیت دی گئی۔ ادیبوں نے انسان کی ذہنی الجھنوں، اس کی پریشانیوں اور احساسات و جذبات کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ داخلی حقیقت نگاری اس دور کے افسانوں کا اہم موضوع تھا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے خارجی حقیقت کو اپنے افسانوں میں بیان کیا لیکن جدید افسانہ نگار نے فرد کی ذات کے اندروں میں غوطہ لگا کر اس کے اندر چھپے احساسات اس کی دلی کیفیات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس جدید دور کے افسانہ نگار نے بھی سماجی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا لیکن پہلے کے افسانہ نگار اور جدید افسانہ میں سب سے بڑا فرق اندازِ بیان کا فرق تھا۔ یعنی سماجی مسائل نے انسان کے باطن پر جو اثرات مرتب کئے ان کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ جدید افسانے میں انسان کی داخلیت پر توجہ دی گئی اس بارے میں سلیم اختر لکھتے ہیں:

> "اب افسانے کا رخ خارج سے مڑ کر باطن کی دنیا کی طرف موڑ دیا گیا۔ ترقی پسند ادب میں انسان اور انسان دوستی پہلے آدرش بنے اور پھر نعرہ! لیکن جدید ترین افسانے اس نعرہ کو کوئی اہمیت نہیں دی گو اس نے بھی انسان ہی کو اپنا موضوع قرار دیا۔ چنانچہ آج کے افسانوں میں انسان اپنی ذات کے ہفت خواں طے کرتا نظر آتا ہے، انتشار ذہن کی تصویر نظر آتی ہے اور شکست ذات جن المیوں کو جنم دیتی ہے ان کی کہانی سنائی جاتی ہے۔ حقیقت پسندی تو یہ بھی ہے مگر فرق یہ

ہے کہ ترقی پسند افسانے نے اگر خارجی حقیقت نگاری پر زور دیا تو موجودہ افسانے نے داخلی حقیقت نگاری کو اپنا شعار بنایا۔"(۴)

اس دور میں فرد کی ذات کو اہمیت دی گئی ایک انسان ہونے کے ناطے کسی حالات و واقعات کے اثرات جو انسان پر مرتب ہوئے۔ اس کے اس بارے میں تصورات کیا ہیں؟ وہ کسی چیز کے بارے میں کس انداز سے سوچتا ہے؟ ان تصورات کو بنیاد بنا کر افسانے تخلیق کیے گئے۔

"شب خون" کے جدید افسانوں نے انسان کی نفسیات اس کے احساسات کی تصویر کشی اپنے افسانوں میں پیش کرنا شروع کی۔ خارجی حقیقت نگاری کے بجائے داخلی حقیقت نگاری کو اپنا منشور بنایا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے مقصدیت کو اس قدر حاوی نہیں کیا کہ افسانہ پروپیگنڈہ بن جائے اس دور کے افسانہ نگار نے مورخانہ اور اطلاعاتی بیان سے گریز کیا۔ "شب خون" کے افسانوں کی بنیادی خصوصیت تخلیقیت ٹھہری۔

ادیب بھی اس سماج کا حصہ ہے وہ جو ادب تخلیق کرتا ہے اس کی ڈور سماج سے ہی جڑی ہوئی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد ہونے والے حالات و واقعات کا اثر قبول کرتا ہے۔ اس لیے جو جدید افسانہ تخلیق کیا گیا وہ بھی اپنے دور کے سماجی حالات و واقعات کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ جدید دور میں جیسے جیسے انسان کی زندگی گزارنے کے طور طریقے بدلے، گاؤں سے شہر کی جانب لوگ منتقل ہونے لگے، شہروں کی زندگی، شہروں کی توسیع، بڑھتی ہوئی آبادی وغیرہ یعنی جدید زندگی نے کئی اور مسائل کو بھی جنم دیا اس لیے اس دور کے افسانہ نگار کے ہاں لاتعداد نئے موضوعات آگئے۔ سکول، کالجوں کی زندگی، دفتروں کا ماحول، کلرکوں کی زندگی وغیرہ کے موضوعات پر افسانے لکھے گئے کئی ایسے افسانہ نگار بھی تھے جنھوں نے دیہی زندگی کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس کے علاوہ مادیت پرستی، تعصب و فرقہ پرستی، نئے انسان کی کھوکھلی عظمت بھی اس دور کے افسانوں کے موضوعات بنے۔ یعنی جدید افسانہ جدید دور کے انسان کی سماجی اور معاشرتی زندگی کا عکاس ہے۔ جدیدیت کے دور کے افسانہ نگار نے سماجی مسائل، سیاسی حالات کی وجہ سے انسان کے باطن پر پڑنے والے اثرات کی وجہ سے اس کی داخلی کیفیات کو افسانے کا موضوع بنایا یعنی داخلی حقیقت نگاری، جدید افسانے کے موضوعات تھے۔

اس دور کے افسانہ نگاروں کا ایک اہم موضوع انسان کی بٹی ہوئی شخصیت، ظاہر اور باطن کے درمیان ذہنی کشمکش تھا۔ اس موضوع پر ہمیں "شب خون" میں کئی افسانے نظر آتے ہیں۔ مثلاً "شب خون" کے شمارہ ۲۲ مارچ ۱۹۶۸ء میں رام لعل کا افسانہ "چاپ" چھپا جو اسی موضوع پر ہے۔ جس میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے فرد کی کہانی ہے جو ایک دفتر میں کلرک ہے۔ اس کی آمدنی بہت محدود ہے۔ وہ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی کافی زیادہ خواہشات پوری نہیں ہو پاتیں۔ وہ ان خواہشات کی تکمیل کے لیے کافی زیادہ دولت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس دولت سے وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکے۔ پھر اس کے اندر کا

انسان جو اس کی نفسیات کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ جس گھر میں وہ رہتا ہے اس کے کمرے میں خزانہ ہے۔ اگر وہ زمین کھود کر خزانہ نکالنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر وہ ایک امیر آدمی ہو گا اس کی تمام ادھوری حسرتیں پوری ہو جائیں گی۔ یہ سوچتے ہی وہ اس خزانے کو حاصل کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیتا ہے وہ کمرے میں جا کر دن رات خزانے کی تلاش کے لئے گڑھا کھودتا ہے۔ وہ گھر پر تالا لگائے رکھتا ہے تا کہ لوگ سمجھیں وہ گھر پر موجود نہیں ہے وہ اس دولت کے پیچھے اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ وہ تمام وقت اس خزانے کی تلاش میں زمین کھودتا جاتا ہے۔ دن رات کی سخت محنت اس کو لاغر اور کمزور بنا دیتی ہے۔ آخر وہ خواہشات کے منوں مٹی کے بوجھ تلے دب کے مر جاتا ہے اس افسانے کے بارے میں رشید امجد لکھتے ہیں:

> "رام لعل کے افسانے "چاپ" کا مرکزی کردار وکاس کئی خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس کی شخصیت پر دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ یہ کردار متوسط طبقے کے کمپلیکسز کا نمائندہ ہے یہ افسانہ انسان کے فطری رجحانات اور خواہشات کا دل چسپ مطالعہ ہے اس میں ذات کے بکھرنے اور خانوں میں بٹ جانا بنیادی تنازعہ ہے۔"(۵)

شہروں میں زندگی کی بنیادی سہولیات آسانی سے میسر تھیں۔ کچھ لوگ ان سہولیات کی وجہ سے کچھ لوگ روزی روٹی کی تلاش میں نوکریوں کی جستجو میں گاؤں کو چھوڑ کر شہروں کی جانب منتقل ہو رہے تھے۔ سائنسی ایجادات کی وجہ سے بہت سی نئی چیزیں سامنے آ رہی تھیں جو پرانی چیزوں کی جگہ لے رہی تھیں۔ گاؤں سے شہروں کی جانب آبادی کا منتقل ہونا اور ایک پرانی تہذیب سے نئی کی جانب منتقلی ایسی باتیں تھیں۔ جس نے ایک حساس انسان پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ انسان کی ان نفسیات کو بھی جدید دور کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے کا موضوع بنایا اور انسان کا ذہنی تناؤ اس دور کے افسانوں کا موضوع بنا۔ اس ہی موضوع پر "شب خون" میں بلراج کومل کا افسانہ "کنواں" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ اس افسانے میں بھی جدید معاشرے سے قدیم معاشرے کی طرف ہجرت دکھائی گئی ہے۔ اس افسانے کا کردار یہ سمجھتا ہے کہ نل آنے کی وجہ سے کنویں کی افادیت ختم ہو چکی ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ ان کو بے مصرف ہونے سے بچایا جائے۔ کنواں پرانی تہذیب کی علامت ہے اور نل جدید دور کی علامت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ کنویں سے نل کی جانب سفر قدیم معاشرتی نظام سے جدید معاشرتی نظام کی جانب ہجرت ہے۔ اس افسانے کا کردار کو لنگر کہتا ہے کہ نل کے آجانے کی وجہ سے کنویں بے مصرف ہو گئے ہیں اس لئے وہ ان کنوؤں کو پھلانگنے کا کام شروع کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بہت مشہور ہو جاتا ہے اس کی اس شہرت کی وجہ سے ہی اس کو کنواں پھلانگنے کے مقابلے میں حصہ لینے کی پیشکش کی جاتی ہے وہ قبول کر لیتا ہے اور کنواں پھلانگنے کے مقابلے میں حصہ لینے کے بعد وہ مشق کرنے کے لیے ایک کنوئیں کا انتخاب کرتا ہے وہاں پر اس کی ملاقات ایک اجنبی سے ہوتی ہے وہ اجنبی کوئی اور کردار نہیں بلکہ وہ اس

کے اندر کی بے نام ذات ہے کنوئیں پر اس کی اجنبی سے گفتگو اس کی ذہنی کشمکش کا بیان ہے آخر میں وہ چھلانگ لگا کر مر جاتا ہے۔ اس افسانے کے موضوع کے بارے میں رشید امجد لکھتے ہیں:

> بلراج کومل کے "کنواں" کا مرکزی کردار کو لنگر ذہین شہری کے روپ میں "چیزوں کے بیکار سمجھ کر ترک کر دینے کے خلاف ایک طنزیہ رجحان ہے۔ بنیادی طور پر کنویں سے نل کی طرف ہجرت ایک معاشرے اور تہذیب کی اپنی اصل بنیادوں سے دوسرے غیر منطقے کی طرف سفر کی غماز ہے۔ کنواں ایک مخصوص معاشرے اور تہذیب کی طرف اشاریہ ہے۔ یہ تہذیب جو زمین سے لپٹی ہوئی ہے اور جس کی جڑیں دھرتی کے سینے میں دور تک اتری ہوئی ہیں۔ کو لنگر کا چھلانگ لگانے کا عمل اس کی تہذیب کے انسان کی وہ ذہنی جست ہے جس سے وہ خلاؤں میں معلق ہو گیا ہے اور دھرتی سے دور، یہی حال کو لنگر کا ہوتا ہے اس کی چھلانگ ہی اس کی موت کا اعلان نامہ ہے۔ وہ بٹی ہوئی شخصیت کا مسئلہ ہے کنویں پر اس کی ملاقات جس آدمی سے ہوتی ہے وہ اس کے اندر کی بے نام ذات ہے۔"(۶)

اس دور کے افسانوں کا ایک اہم موضوع زرعی معاشرے سے جدید معاشرے کی طرف منتقلی ہے ۔"شب خون" میں چھپنے والا سریندر پرکاش کا افسانہ "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" میں زرعی معاشرے سے جدید معاشرے کی طرف منتقلی کو کہانی کی صورت میں بیان کیا ہے۔ یہ افسانہ قدیم و جدید عہد کو ملاتے ہوئے مختلف تصویروں کی عکاسی پیش کرتا ہے۔ اس افسانہ میں گرد آلود پگڈنڈیوں کو چھوڑ کر چکنی سڑک پر چلنا قدیم تہذیب سے جدید کی طرف ہجرت ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے قدیم و جدید تہذیب کے ٹکراؤ، اقدار کی شکست و ریخت اور نا آسودہ خواہشات کے اظہار کا اشارہ ہے ڈرائنگ روم اس معاشرے کی علامت ہے پہاڑوں اور وادیوں سے آنے والا شخص قدیم عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ قدیم و جدید عہد کی تہذیبوں کا ٹکراؤ ہی اس افسانے کا موضوع ہے جس کو افسانہ نگار نے بہت سی چھوٹی بڑی علامتوں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس افسانے کے بارے میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری لکھتے ہیں:

> "یہ کہانی آج کے معاشرے کی جیتی جاگتی کہانی ہے۔ معاشرے میں تہذیبی اقدار کا زوال جس برق رفتاری سے ہو رہا ہے، اس کا اشارہ ہے۔ ڈرائنگ روم ہمارا معاشرہ ہے جہاں ہم سب سانسیں لیتے ہیں، جہاں ہماری خانگی زندگی بھی اور ہماری خواہشات کا سمندر بھی۔ مذکورہ کہانی جدیدیت کے رجحان کی رجحان ساز کہانی ہے۔ اس میں علامتوں اور استعاروں کا خوبصورت استعمال تو ہے ہی جذبات نگاری اور جزئیات نگاری کا بھی حسین سنگم ہے۔"(۷)

"شب خون" میں ظفر اوگانوی کا افسانہ "باؤلی اور ٹینک" میں بھی دو تہذیبوں کا ٹکراؤ پیش کیا ہے ۔ اس افسانے میں بھی ٹینک مشینی عہد کی علامت کے طور پر آیا ہے ٹینک چیختا چنگھاڑتا پرانے عہد کو روندتا ہوا

آگے نکلتا جاتا ہے۔ ظفر اوگانوی کا افسانہ "قیادت" جدید افسانہ ہے یہ افسانہ صنعتی معاشرے کے انسان کا المیہ ہے۔ دبیر احمد اس افسانے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "افسانہ " قیادت " ظفر اوگانوی کا معروف افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے صنعتی اور مشینی معاشرے کے انسان کے المیہ کو موضوع بنایا ہے جس میں انسان کی داخلی شخصیت کے بکھرنے نیز سماجی اور تہذیبی اقدار کی شکست کی داستانِ حیات ہے۔ دراصل ہم جس سماج اور معاشرے میں رہتے ہیں۔ زوال اور انحطاط سے پر ہے۔ انسان خود اپنی شناخت سے محروم ہو چکا ہے۔" (۸)

اس دور کے افسانہ نگاروں نے پرانی تہذیب کی مٹتی ہوئی اقدار کو جدید مشینی معاشرے کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ کچھ لوگ ماضی کی طرف لوٹ جانا چاہتے ہیں۔ مستقبل کا خوف ان کے افسانوں سے عیاں ہے۔ "شب خون" میں چھپنے والے سریندر پرکاش کے افسانہ "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" بلراج کومل کے "کنواں" ظفر اوگانوی کے "بیچ کا ورق" کے موضوعات کے بارے میں دبیر احمد لکھتے ہیں:

> ان افسانہ نگاروں کے موضوعات میں چار مختلف رجحانات کی نمایاں طور پر عکاسی ملتی ہے ۔ماضی کی طرف لوٹ جانے کا رجحان، مستقبل کا خوف حالات کے تاریک پہلوؤں کی تصویر کشی کائنات کو ذات کے اندر محصور کرنے کا جذبہ، زندگی کے بے مفہوم ہونے کا احساس۔ اس کے لئے "ماچس"، "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم" "کنواں"، "بیچ کا ورق" کی مثالیں بلا جھجک پیش کی جاسکتی ہیں۔" (۹)

باطنی کیفیات کا بیان جدید افسانے کا موضوع رہا ہے سریندر پرکاش کے ہاں بھی ہمیں اس طرح کے خیالات ملتے ہیں۔ ان کے افسانے "رونے کی آواز" میں بھی انسان کے اندرونی اظہار کا بیان ملتا ہے۔ انسان کی نفسیات کو جدید افسانہ نگاروں نے اپنے افسانے کا موضوع بنایا اس سے پہلے بھی نفسیات کو افسانہ نگار اپنے افسانوں کا موضوع بناتے رہے لیکن پہلے کے افسانوں اور جدید افسانوں میں جو نفسیاتی موضوعات کے بیان کا فرق ہے اس کے بارے میں رشید امجد لکھتے ہیں:

> "نفسیات افسانے کے لئے نیا موضوع نہیں مگر پرانے افسانہ نگار نفسیات کے علم سے پوری طرح واقف نہ تھے اس لئے ان کے یہاں نفسیاتی مطالعہ قیاسی اور سرسری تھا۔ نئے افسانہ نگار نے نفسیات کے ساتھ لاشعور کی دریافت کا سہرا بھی باندھا ہے۔ وہ لاشعور کے سمندر میں غوطہ لگا کر قیمتی موتی تلاش کرتا ہے۔ انفرادی لاشعور کی بازیافت سے اجتماعی لاشعور کی دریافت کرتا ہے ۔" (۱۰)

جیلانی بانو کا "شب خون" میں چھپنے والا افسانہ "سکوٹر والا" نفسیاتی الجھن اور ذہنی کشمکش کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار عابدہ ہے جس کے گھر کے سامنے سے روز سکوٹر والا گزرتا ہے ۔جس کی آواز سے وہ پریشان ہوتی ہے جس وقت وہ اپنے چھوٹے سے بچے کو سلاتی ہے تو گلی میں سے گزرنے والے سکوٹر کے شور سے جاگ جاتا ہے۔بچہ نیند سے جب اٹھتا ہے تو بے قرار ہو کر روتا ہے۔وہ اس شور سے بہت تنگ ہوتی ہے۔وہ سکوٹر والے کو مرنے کی بد دعائیں بھی دیتی ہے۔پھر اچانک سے گلی سے کافی دن تک سکوٹر کی آواز نہیں آتی۔ان ہی دنوں محلے میں کسی کی موت بھی ہوتی ہے موت کی خبر سے عابدہ پریشان ہو جاتی ہے۔وہ سمجھتی ہے کہ اس کی بد دعا سے وہ مر گیا ہے۔اس کی موت کا صدمہ اس کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیتا ہے جب آخر میں اس کو اسکوٹر کی آواز سن کے پتہ چلتا ہے کہ اسکوٹر والا زندہ ہے۔وہ خوشی سے اس سے لپٹ کر چلاتی ہے میرا کوئی نہیں مرا۔جیلانی بانو کا یہ افسانہ نفسیاتی مطالعے کو پیش کرتا ہے۔یہ بھی "شب خون" کے افسانوں میں شامل ایک اچھا افسانہ ہے۔اس افسانے کے بارے میں وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

> "جیلانی بانو کے افسانوں کو پڑھتے ہوئے سب سے پہلے میری نگاہ ان افسانوں کی طرف جاتی ہے ،جہاں جیلانی بانو نفسیاتی کشمکش کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتی ہیں۔ذہن ودماغ کو نہ صرف چھوتے ہیں بلکہ اس میں رچ بس جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے مشہور افسانے "سکوٹر والا" ذہن میں لائیے۔پوری اردو افسانے کی تاریخ میں کوئی دوسرا افسانہ اس قبیل کا نہ ملے گا۔"(۱۱)

اس دور کے افسانوں کا ایک اور اہم موضوع مادیت پرستی ،منافع خوری اور خود غرضی ہے۔ اس موضوع پر ہمیں غیاث احمد گدی کا افسانہ "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" ہے۔اس کہانی میں روز ایک گاڑی آتی ہے اور کوئی نہ کوئی پرندہ پکڑ کر لے جاتی ہے لیکن پرندوں کو پکڑنے کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کرتا منی بائی اپنے طوطے کو کچھ رقم کے عوض فروخت کرنے کے لیے تیار ہے۔یہ گاڑی روز پرندوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے لیکن کوئی بھی گاڑی والوں کو ایسا کرنے سے منع نہیں کرتا ایک چھوٹا بچہ گاڑی والوں سے الجھتا ہے۔اس افسانے میں لوگوں کی خود غرضی کو بیان کیا ہے۔اس افسانے کے موضوع کے بارے میں عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> "پرندہ پکڑنے والی گاڑی" کا عنوان ہی جدید تمدن کی بڑھتی ہوئی میکانکیت" پر طنز کی ایک علامت ہے۔کاروباری مفادات اس شدت کے ساتھ زمین اور اس کی فضا کو مظاہرِ فطرت سے خالی کرتے جارہے ہیں۔ہر چیز مالِ تجارت ہے اور کسی صنعت کا ایندھن ہے یہ صورتِ حال خاص کر نئی نسل کی سادگی اور معصومیت کے سامنے ایک سوالیہ نشان بن کر آتی ہے۔اور اس کے ذہن کو پریشان اور مجروح کرتی ہے۔سب اپنے اپنے مفاد کی خدمت میں مگن ہیں اور اپنی عزیز ترین متاع کو بھی کسی معمولی فائدے کے لئے قربان کر سکتے ہیں۔"(۱۲)

اس دور کے افسانہ نگاروں کا ایک اور موضوع کلرکوں کی زندگی اور دفتری استحصال ہے۔اس کی بہترین مثال انور سجاد کا افسانہ "چھٹی کا دن" ہے۔ جس کی کہانی ایک کلرک کی زندگی کے گرد گھومتی ہے۔ جو ہر وقت دفتری کاموں میں الجھا رہتا ہے۔ صبح دفتر جاتا ہے سارا دن فائلوں میں سر کھپانے کے بعد شام کو بچی فائلیں گھر لاتا ہے۔ سارا دن سخت محنت کرتا ہے۔ افسروں کے سامنے سارا دن یس سر، نو سر، تھینک یو سر اور فائلوں میں سارا وقت کام کرنا اس کے کام کے بدلے میں ترقی کی لالچ دی جاتی ہے۔ ان کام کی الجھنوں نے اس کے جذبات سرد کر دیئے ہیں۔ وہ چھٹی کے دن اپنی بیوی کے ساتھ سیر پر جاتا ہے لیکن دفتری الجھنیں اس کے ذہن کو جکڑے رکھتی ہیں۔ اس کا ذہن ان الجھنوں میں ہی الجھا رہتا ہے اس کے بارے میں مہدی جعفر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> "دفتر کیا ہے؟ انسان (کلرک) کی آزاد اور تازہ فطرت کو قید کرنے، بدل ڈالنے اور اپنے قدرتی ماحول سے بے آہنگ کر دینے کی نفع پرور انتظامیہ سازش ہے۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو آفس مشرقی خط پر مغربی تدبیر کاری اور مغائر طور طریقوں کے تسلط کی علامت بن گیا ہے انسان کو ترقی کے لالچ میں گرفتار کر کے اس بیکراں انبساط سے محروم کر دیا گیا ہے جو اس کا حق تھا اور جس کا ایک ادنیٰ جزو چھٹی کا دن، ہو سکتا تھا مگر کلرک کی داخلی کیفیت اتنی المناک بنا دی گئی ہے کہ فطری سیر کا لطف نہیں اٹھا سکتا ۔۔۔۔۔افسانہ ہے۔یورپین کلچر سے شدید ردِ عمل dis.orientation جدید کلچر کا ہے جس نے مشرقی لطافت سے اور طمانیت چھین لی ہے۔"(۱۳)

نسلی امتیازات اور ذات پات کی تفریق جیسے غیر انسانی اقدار اور رویے بھی اس دور کی کہانیوں کا موضوع بنے۔ اس موضوع پر ہمیں جوگندر پال کا افسانہ "کتھا ایک پیپل کی" ملتا ہے۔ اس افسانے میں پیپل انسانوں کی طرح سوچتے اور بولتے ہیں۔ انسانوں کی طرح ہی محسوس بھی کرتے ہیں۔ پیپلوں کے ذریعے سے ہی جوگندر پال نے انسانی زندگی کے مسائل اور اس کی الجھنوں اور پیچیدگیوں کو سامنے لایا ہے۔ جوگندر پال کہتے ہیں انسان مجبور بن کر زندگی نہ گزارے بلکہ آزادی سے سر اٹھا کر جیئے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> "تمھارا ہی بچہ ہے، یا کم سے کم اپنی ہی ذات میں سے کسی کا ہے۔ کسی کوے کی اولاد تو نہیں۔ اس نے اپنی آواز ذرا آہستہ کر لی کہ آس پاس کوئی اس کی بولی کی بھنک نہ پالے۔ پہلے ہی سے سب کو شکایت تھی کہ اس برہمنی کو اپنی اونچی ذات پر بڑا مان ہے۔ "بس جی چپ رہو تم۔ بچے کی نیا ڈبو کر دم لو گی" پھر وہی موئے آدم کا کانا سا محاورہ!۔۔۔ ہمیں نیا ویا سے کیا لینا ہے؟ ہمارے یہ پر سلامت رہیں"(۱۴)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس دور کے افسانہ نگاروں نے فرد کے اندرون کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ سیاسی جبر و استحصال، شخصیت کے بکھراؤ، انسان کی ذہنی کشمکش مرد و عورت کے رشتے اور عورت کے استحصال کو نئے زاویہ نظر سے دیکھا اسے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ اس دور کے موضوعات کے بارے میں احمد علی جوہر لکھتے ہیں:

"صنعتی عہد میں انسان کو ایک طرف مادی آسائشیں مہیا ہوئیں تو دوسری طرف انتہائی پیچیدہ قسم کے خوفناک مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ ایسے مسائل میں انسانی وجود کی معدوم ہوتی شناخت ،ذات کی تلاش کا مسلہء، اخلاقی و روحانی قدروں کا زوال اور اس کا افسوس، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت اور اس کا کرب، احساس تنہائی، محرومی و مایوسی، احساسِ شکستگی اور عدم تحفظ کا مسلہء، معاشرہ کی سطحیت و بے معنویت اور اس کا کھوکھلا پن، فرد کی مجہولیت اس کی بے چہرگی ،بے بسی، مجبوری ولاچاری، بے سمتی، ڈر اور خوف کی نفسیات، ذہنی انتشار، جنسی و جذباتی گھٹن ،روحانی کرب، اجنبیت و بے گانگی ،خواہش مرگ ،زندگی کی لغویت و لا حاصلیت وغیرہ ہیں۔"(۱۵)

یعنی جدید افسانہ اپنے عہد کے حالات و واقعات کی روداد سناتا نظر آتا ہے۔ اس دور کے انسان کی نفسیات اس کے کرب اس کی الجھنوں کو بیان کرتا ہے اگر جدید افسانے اور قدیم افسانے کے موضوعات کے فرق کو اگر ایک سطر میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے۔ اس دور میں بھی افسانے کا رشتہ سماج سے ویسا ہی جڑا ہوا ہے جیسا اس سے پہلے لکھے جانے والے افسانے کا تھا ان افسانہ نگاروں نے سماجی واقعات کی تصویر کھینچنے کے بجائے ان واقعات کے اثرات کی تصویر کھینچی ہے۔ اس دور میں سیاسی جبریت اور استحصال ایک ایسا موضوع ہے ۔ جس پر پاکستان کے نئے افسانہ نگاروں نے بھی کچھ افسانے ضرور لکھے ہیں۔ "شب خون" میں چھپنے والے اعجاز راہی کے افسانے کا موضوع بھی یہ ہی ہے اس سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

"افسوس۔ اب ہمیں تجربوں کے خوفناک آسیب بھی ناکام عمل دہرانے سے نہیں روک سکتے کہ ہم جو اپنی ہی سرزمین کو بار بار فتح کرنے کے عادی ہو چکے ہیں، قطب شمالی کے سفید بھیڑوں کی طرح آنکھ جھپکنے کے کسی موقع کو خالی نہیں جانے دیا چاہتے کبھی نہیں کبھی نہیں۔"(۱۶)

اس دور کے جبر اور ناانصافیوں کو جس انتہا تک پہنچنا ہے آئندہ نسل اس سے محفوظ رہے وہ پریشان کن حالات میں بھی مایوس نہیں ہوتے بلکہ وہ آئندہ آنے والے دنوں سے اچھی امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں شاید یہ سب یہاں ہی ختم ہو جائے۔ ہماری آنے والی نسل ان پریشانیوں سے محفوظ رہے۔ شفق کا افسانہ "سیاہ کتا" جو کہ شب خون کے شمارہ ۷۹ میں ۱۹۷۲ء کو شائع ہوا۔ اس افسانے میں مصنف نے جدید عہد کے انسان کی بے یقینی اور بے اطمینانی کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ یعنی جدید عہد کا انسان جس بے یقینی اور بے اطمینانی

کا شکار ہے۔ اس کو اس جبر اور ناانصافی سے کب چھٹکارا ملے گا۔ وہ چاہتا ہے کہ اس عہد کا جبر اور ناانصافیاں اپنی انتہا تک پہنچ کر یہاں ہی ختم ہو جائیں۔ آئندہ آنے والی نئی نسل اس سے بچ جائے۔ یعنی شفق نے اپنے اس افسانے میں ایسی ہی امید دلانے کی کوشش کی ہے کہ اس کی نسل نے جو تباہی خون ریزی دیکھی وہ آئندہ آنے والی نسل نہ دیکھے۔

اپنے افسانے کے آخری اقتباس میں انھوں نے ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اور جب فصل تیار ہونے والی تھی۔ ایک شام جب میں کدال کندھے پر رکھے کروندے کی جھاڑیوں سے گزر رہا تھا اچانک اس کتے نے مجھ پر چھلانگ لگائی۔ میں نے بچنے کی کوشش کی ،بھاگنا شروع کیا۔ مگر میں تھک چکا تھا۔ مجھ سے بھاگا نہ گیا۔ اور جب کتا میری گردن میں دانت گاڑ کر میرا خون پی رہا تھا۔ میری صرف ایک تمنا تھی۔ کاش اس کی پیاس بجھ جائے۔ کاش میرا بچہ۔۔۔۔۔۔؟؟"(۱۷)

مشینی عہد میں انسان جس مایوسی جس بے اطمینانی کا شکار تھا۔ اس ذہنی ہیجان دکھ کرب کی تصویریں ہمیں اس دور کے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ اس دور کا انسان جذبات سے عاری ہو چکا ہے وہ ایک کھوکھلی زندگی گزار رہا ہے۔ اس کا چہرہ بھی بالکل سپاٹ ہو چکا ہے اب اس کے چہرے پر کوئی احساسات نہیں ابھرتے ہیں۔ مشینی عہد کے اس معاشرے کے بارے میں صبا اکرام لکھتی ہیں:

مشینی عہد کے پیدا کردہ معاشرے میں "زندگی میں موت" کی اس "کیفیت کا اظہار اردو کے جدید افسانوں میں نظر آجاتا ہے۔ جو زندگی کی حرارت سے یکسر محروم ہے۔ اور قمر احسن کے افسانہ "یا مصطفیٰ" میں یہ فرد ایک ایسی چلتی پھرتی لاش نظر آتا ہے جس کی آنکھیں زندگی کی چمک سے خالی اور چہرہ جینے کے احساس سے عاری ہے۔۔۔۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے سے الگ الگ رہتی تھیں۔ جذبات سے عاری آنکھیں، عرصہ ہوا جب اس کی آنکھوں سے چمک غائب ہو گئی تھی اور چہرے سے تمام احساسات کی لکیریں معدوم ہو گئی تھی۔"(۱۸)

عالمی سطح پر انسان جن خطرات کا شکار ہیں ان میں سے ایک خطرہ جنگ کا بھی ہے۔ اس عہد میں جنگ کا تصور بدل گیا ہے۔ تلواروں کی جگہ گولیوں نے لے لی تھی۔ جس سے زیادہ تباہی برپا ہوتی تھی۔ اس چیز نے انسان کو عدم تحفظ کا احساس دیا۔ اب اس طرح کے خیالات کی جھلک ہمیں اردو افسانے میں بھی نظر آنے لگی۔ قمر احسن کے افسانہ "صدیاں" کا یہ اقتباس کچھ یوں ہے:

"مشین گنوں کی اچانک ریٹ ٹیٹ سے عارف عبداللہ اٹھ بیٹھا کچھ گولیاں اس کے سر پر سے گزریں تو اس نے سر ریت کے ایک گڑھے میں چھپا لیا۔ جس سے اس کے منہ میں ڈھیر ساری

ریت چلی گئی۔ پھر یک بیک اس نے گھبرا کر اپنا منہ اٹھالیا۔ اس لئے کہ ریت کے ذروں میں اسے خون کی نمکینی محسوس ہو رہی تھی۔"(۱۹)

ایٹم بم کے بن جانے کے بعد انسان کو دوسرا بڑا خطرہ ایٹمی تباہ کاری کا ہے۔ ایٹمی بم سے اتنی بڑی تباہ کاری ہو گی کہ کچھ چیز باقی نہیں بچے گی ایٹم بم کی تباہ کاریوں سے آج کا انسان باخبر ہے۔ اس لئے اس تباہ کاری کا خوف بھی کہیں نہ کہیں انسان کے ذہن میں موجود ہے۔ انسان کسی حد تک اس ایٹمی ہتھیاروں کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار بھی ہے۔ اس لئے یہ موضوع موجودہ دور کا ایک اہم موضوع ہے۔ جس کی بازگشت جدید افسانے میں بھی سنی جا سکتی ہے۔ شب خون میں چھپنے والے شفیع جاوید کے افسانے " ایک تاریک بے راہ جنگل" کا ایک اقتباس یہ ہے:

"اور وہ تمھاری خود فریبی، وہ دن بہت دور نہیں میرے دوست جب دنیا صرف ایک مٹھی ایٹمی راکھ بن کر ختم ہو جائے گی۔"(۲۰)

"شب خون" کے رسالے میں چھپنے والے افسانے اپنے عہد کے عکاس ہیں۔ جدید صنعتی معاشرے کی وجہ سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہ افسانے ان تبدیلیوں کی روداد سناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جدید شہری زندگی کی بے چہرگی، دفتری زندگی کی بے معنویت، انسان کی کھوکھلی عظمت یہ ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے انسان اپنے باطن کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ اس دور کا شخص صنعتی معاشرے سے بے اطمینانی کا شکار نظر آتا ہے۔ ان سب افسانہ نگاروں نے ذاتی تصورات و احساسات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ افسانہ نگاروں کو نئی سوچ اور نئی فکر سے روشناس کروایا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے نئے اور اچھوتے موضوعات کو افسانے میں پیش کر کے افسانہ کو فکری سطح پر وسعت عطا کی۔ داخلیت، باطنی کیفیات، نئی اور پرانی تہذیب کا ٹکراؤ اس کی وجہ سے انسان کے ذہن پر مرتب ہونے والے اثرات، سیاسی مسائل، جدید دور کے انسان کا ذہنی انتشار، انسان کی نفسیاتی کیفیات جدید افسانے کے موضوعات تھے۔ جس پر بہت سے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، انٹرویو شمس الرحمٰن فاروقی سے ایک گفتگو، مشمولہ شمس الرحمٰن فاروقی محو گفتگو، مرتبہ ڈاکٹر راحیل صدیقی، (نئی دہلی، رعنا کتاب گھر، ۲۰۰۳ء) ص ۱

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، میری گزارشِ احوال واقعی، مشمولہ بنیاد، شمارہ ۱، لاہور، جلد سوم، ۲۰۱۳ء، ص ۲۲

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، انٹرویو، شمس الرحمٰن فاروقی سے ایک گفتگو، ص ۱۵۳

۴۔ سلیم اختر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، اردو رائٹرز گلڈ، الہ آباد، ۱۹۸۰ء، ص ۱۰۵

۵۔ رشید امجد، افسانے کے نئے موضوعات، مشمولہ، پاکستانی ادب تنقید، (راولپنڈی، فیڈرل گورنمنٹ کالج، ۱۹۸۲ء، پانچویں جلد) ص ۸۶

۶۔ رشید امجد، مضمون، افسانے کے نئے موضوعات، مشمولہ، پاکستانی ادب تنقید، ص ۸۷-۸۸

۷۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، جدیدیت اور اردو افسانہ (نئی دہلی،، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۱،) ص ۴۱

۸۔ دبیر احمد، ظفر اوگانوی حیات و خدمات، (کلکتہ، مدیحہ پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء) ص ۱۹۳

۹۔ ایضاً، ص ۲۰۱

۱۰۔ رشید امجد، مضمون، افسانے کے نئے موضوعات، مشمولہ، پاکستانی ادب تنقید، ص ۹۴

۱۱۔ وہاب اشرفی، جیلانی بانو کی تخلیقی جہات، مشمولہ، شب خون، شمارہ ۲۲۲، ۱۹۹۸ء، ص ۲۱

۱۲۔ عبد المغنی، غیاث احمد گدی کی افسانہ نگاری، مشمولہ، شب خون، شمارہ ۱۹۸۰، ۱۱۴ء، ص ۵۲

۱۳۔ مہدی جعفر، انور سجاد کی امیجری اور میری ہوا خوری، مشمولہ، شب خون، شمارہ ۱۱۹۹، ۲۳۱ء، ص ۴۰

۱۴۔ جوگندر پال، کتھا ایک پیپل کی، مشمولہ شب خون، شمارہ ۸۰، الہ آباد، ۱۹۷۳ء، ص ۳۵

۱۵ احمد علی جوہر، طارق چھتاری: فکر و فن (دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، س، ن)، ص ۴۰

۱۶۔ اعجاز راہی، سہیم ظلمات، مشمولہ،، شب خون، شمارہ ۱۱۱، الہ آباد، ۱۹۷۹ء، ص ۶۵

۱۷۔ شفق، سیاہ کتا، مشمولہ، شب خون، شمارہ ۷۹، الہ آباد، ۱۹۷۰ء، ص ۵۷

۱۸۔ صبا اکرام، مضمون، جدید افسانہ اور کھوئی ہوئی پہچان، مشمولہ جدید افسانہ چند صورتیں، ۲۰۰۱ء، ص ۵۴

۱۹۔ قمر احسن، صدیاں مشمولہ، شب خون، شمارہ ۴۲، الہ آباد، ۱۹۶۹ء، ص ۳۹

۲۰۔ شفیع جاوید، تاریک بے راہ جنگل، مشمولہ، شب خون، شمارہ ۳۴، الہ آباد، ۱۹۶۹ء، ص ۴۰